قیمت ۴ روپے

شائع کردہ۔ پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی ۵

نذیر احمد

انتظار حسین کے افسانے۔ ایک مطالعہ

تقسیم ملک ہماری تاریخ اور روحانی زندگی میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانان ہند نے اپنی ملی شخصیت اور اپنے تاریخی ورثہ کے تحفظ کے لئے طویل جد وجہد آزادی کے بعد ایک نیا وطن حاصل کیا۔ اس دیرینہ مقصد کے حصول کے بعد ایک نیا میدان عمل ان کے سامنے تھا لیکن اس کامیابی کے پیچھے سینکڑوں ایسے داغ تھے جن کا احساس خاص طور پر ان لوگوں کو بڑی شدت کے ساتھ ہوا جو ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ زمین کا رشتہ ایسا نہیں، جو آدمی جلدی سے فراموش کر سکے۔ درحقیقت تمام انسانی نظریات، عقائد اور جذبات، بلکہ ظاہری رنگ وروپ بھی ("سر دارنی کا جسم ڈھل گیا ہے، لیکن تو اب تک دیتا ہے عجیب بات ہے کہ سردارنی کے لونڈے کو یہ چمک دمک ذرا بھی ورثہ میں نہیں ملی ہے۔ وہ گورا چٹا ضرور ہے مٹی میں بھی نہیں کھیلتا، لیکن اس کے چہرے پر وہ شادابی پھر بھی نظر نہیں آتی جو اس عمر کے بچوں کے چہرے پر کھیلتی نظر آیا کرتی ہے، شاید یہ شادابی اور چمک دمک کا سارا قصہ مٹی کا قصہ ہی ہو۔" آخری موم بتی) ایک ارضی چوکھٹے میں ہی اپنی سالمیت اور صورت قائم رکھ سکتے ہیں، اور جب چوکھٹا ہی متزلزل ہو جائے تو نظریات، عقائد اور جذبات کی دنیا میں بھی ایک زلزلہ آجاتا ہے، اور پوری شخصیت انفرادی اور اجتماعی سطح پر، ایک ایسے جذباتی گرداب میں پھنس جاتی ہے، جس میں ماضی دلپذیر اور مستقبل خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ صورت حال اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ جب زمین چھٹنے کے ساتھ ساتھ ایک پوری تہذیب بھی مٹ رہی ہو۔ انتظار حسین کے ابتدائی افسانوں میں اسی صورتحال کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس کی بعد کی افسانہ نگاری کلیتاً مختلف چیز ہے۔ اس میں ایک خاص ادبی عقیدہ اور مقصد کارفرما ہے اور اس لحاظ سے انتظار حسین بطور افسانہ نگار کے منفرد ہے اور شاید پاکستان بننے کے بعد کے افسانہ نگاروں کی پود میں کسی نے بھی اپنے فنی مسلک کو ایسے استقلال اور لگن کے

ساتھ نہیں نبھایا، جیسے انتظار حسین نے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ انتظار کی شروع کی افسانہ نگاری "آخری آدمی" (مجموعہ) کے لئے راہ ہموار کرتی ہے اس سے یہ مقصود نہیں کہ "گلی کوچے" اور "کنکری" میں شامل افسانے اپنی علیحدہ حیثیت و مقام نہیں رکھتے۔ یہ صرف اس لئے کہا جا رہا ہے کہ بعض ہمعصر نقادوں نے انتظار حسین پر الزام لگایا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دہرا رہا ہے، ویسے تو ایک مرحلے پر پہنچ کر بیشتر ادیبوں کا یہی مقدر ہوتا ہے، ہمارے بہت سے مشہور و معروف شاعر اور افسانہ نگار اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں لیکن میرے خیال میں انتظار کی افسانہ نگاری ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اس نے یکساں معیار قائم رکھا ہے۔ اس کے ہاں ایسے بھی افسانے ملتے ہیں جنہیں بمشکل گوارہ کہا جا سکتا ہے۔ (محل والے، پس ماندگان، مجمع، وغیرہ وغیرہ) لیکن اس کے اچھے افسانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس کا شمار بآسانی اردو کے چند ایک سرکردہ افسانہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے۔

"گلی کوچے" میں شامل تقریباً سبھی، اور کنکری میں شامل اکثر افسانوں میں گہرے Nostalgia کا احساس ملتا ہے، افسانہ نگار کی ماحول، واقعات اور کرداروں کے ساتھ جذباتی وابستگی عیاں ہے، لیکن یہ جذباتی وابستگی ابلاغ کو مانع نہیں بلکہ ایسی کیفیت پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے قارئین کے دل میں ہمدردی اور سوز پیدا ہوتا ہے۔ اگر دلوں پر تعصبات کے قفل نہ پڑے ہوں تو احساس تاسف کی بسیط لہر پوری شخصیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور پڑھنے والا از خود اپنے آپ کو ان جذباتی دھاروں کے سپرد کر دیتا ہے۔ جن کا منبع افسانہ نگار کی ذات ہے۔

افسانہ نگار پرانے ماحول کو تخیلی طور پر زندہ کرتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے چھوٹے چھوٹے واقعات عام کردار اور جزئیات رومانی ہالے میں لپٹے دکھائی دیتے ہیں اور پھر ایکا ایکی ساری تخیلی عمارت مسمار ہو جاتی ہے، تضاد کی یہی صورت پورے افسانے کو جذباتی تاثر کا حامل بنا دیتی ہے، "تیوا کی دکان" اور "خرید و حلوہ بیسن کا" دونوں افسانوں میں جزئیات نگاری کے ذریعہ ایک ماحول استوار کیا گیا ہے جس کے اندر گھومنے والے کردار اپنی اپنی خوشیوں میں مگن دکھلائے گئے ہیں اور وہ معاشرتی روابط کے ایک نظام میں منسلک ہیں۔ اختتام پر ان کے تمام روابط ٹوٹتے دھاگے ثابت ہوتے ہیں اور بہار خزاں میں بدل جاتی ہے۔

ہجرت کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے، اگر اس کی نوعیت صرف نقل مکانی ہوتی تو بھی اس سے ذہنوں

پر گہرے تاثرات مرتب ہوتے، لیکن جب مسلمانوں نے ہندوستان چھوڑا تو صرف زمین نہیں چھوڑی، آباد اجداد کی یادگاریں چھوڑیں اور وہ اپنی تاریخ کی زندہ جاوید شہادتوں سے منقطع ہو گئے۔ اس سے دل و دماغ پر جو گذری، انتظار حسین نے اس کا مطالعہ مختلف سطحوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے حوالے سے کیا ہے۔

"چنانچہ مشن نے مطالبہ کیا" بادا پاکستان میں چل کے قطب صاحب کی لاٹھ دیکھیں گے"
رنو میاں بولے۔ "بیٹا قطب صاحب کی لاٹھ پاکستان میں نہیں ہے" وہ تو دلی میں ہے"
"اچھا بادا تاج بی بی کا روضہ دیکھیں گے" مشن نے ہاتھ کے ہاتھ دوسرا مورچہ تیار کر ڈالا۔
لیکن رنو میاں نے پھر ٹکا سا جواب دے دیا۔
"ابے تاج بی بی کا روضہ آگرہ میں ہے"
پے در پے دو شکستوں نے مشن کی خود اعتمادی کا تو ڈھیر کر ہی دیا تھا اور اب اس نے بوجھ الٹا رنو میاں پر ہی ڈال دیا "تو بادا پاکستان میں کیا ہے"
اور رنو میاں بڑے پیار سے بولے "بیٹا، پاکستان میں قائد اعظم ہیں"
"اجی قائد اعظم ہیں تو ہوا کریں" اماں جی پھر چینک گئیں "ہم ٹانڈا بانڈا لئے کہاں پھرتے پھریں" اور پھر لیکا یک اماں جی نے ایک اور داؤں مارا۔
"اجی ہم چلے گئے تو بڑے بوڑھوں کی قبر پہ کوئی چراغ جلانے والا بھی نہ رہے گا۔"
بیشتر افسانوں کا تعلق ماضی کی یادوں سے ہے۔ ("زندہ چیزوں پر لکھنے کی تک میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں تو مردہ چیزوں پر لکھتا ہوں، آخر زندہ چیزوں پر لکھا کیسے جا سکتا ہے ان میں دو اور دو چار قسم کی قطعیت ہوتی ہے۔ ان میں مبہم گوشے اور پر معنی سائے پیدا نہیں ہوتے" ۔۔۔ ایک ان لکھی رزمیہ) تعزیوں کا اہتمام، اور ان کی تیاریوں میں لوگوں کی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش، نوحہ پڑھنے والوں کا ذوق شوق۔ جلوس تعزیہ ــــ یہ تمام تفصیلات اس ماحول سے متعلق ہیں جو اب ماضی کا حصہ ہے (پھر آئے گی) بعض نقاد حضرات کو ایسے افسانوں میں سوائے ماضی پرستی کے فضول مشغلہ کے کچھ نظر نہیں آیا ہے، لیکن افسانہ کی خوبی ماضی کی یادوں میں نہیں بلکہ ان کرداروں کے مطالعہ میں ہے، جو تہوار میں شریک ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن کا موازنہ نہایت معنی خیز

ہے۔ اگرچہ عورت براہ راست افسانہ میں دخیل نہیں تاہم ماتم کرنے والوں اور نوحہ خوانوں کے جوش و خروش اور سوز و شدت کا نفسیاتی محرک عورت ہی ہے:

" عنایت بے، ہو نہ ہو یہ تو وہی ہے جس پہ کاظم میاں لٹو ہیں "

اور عنایت نے منہ بنا کر جواب دیا، " چھوڑ کاظم میاں کی بات وے تو الو کی دم فاختہ ہیں۔ ان کے بس کا کیا ہے؟ " اور یہ کہتے کہتے اس کے تاشے کی گت بگڑ گئی ۔۔۔۔۔ ماتم کرنے والوں نے اپنے ہاتھوں کو تاشوں کی ضربوں سے ہم آہنگ کرنا چاہا۔ تاشوں پر قمچیاں پہلے آہستہ آہستہ پڑنی شروع ہوئیں۔ ضربوں کے درمیان وقفے واضح اور کھلے تھے، پھر وقفے تنگ ہونے لگے اور ماتمیوں کے ہاتھ تیزی سے اٹھنے لگے۔ پھر یہ وقفے اور سمٹنے لگے اور ضربوں میں اور شدت پیدا ہوئی ماتم اور زور سے ہونے لگا۔ شدن کا ہاتھ سینہ پر پڑ رہا تھا اور نگاہیں ڈاکٹر صاحب کی کوٹھے پر منڈلا رہی تھیں، علمدار بار بار کنکھیوں سے چھجوں اور کوٹھوں کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ "

تقن میاں کی وجہ سے سارے افسانے میں ڈرامائی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

" آخری موم بتی" میں تمام تفصیلات تعزیہ اور عزاداری سے متعلق ہیں۔ اس لئے خود انتظار حسین کو ان سے جذباتی وابستگی ہے، لیکن یہ عین واضح ہے کہ شمیم اور اس کی ماں کا زوال (" اس گھر کی چہل پہل نہ جانے کہاں رخصت ہو گئی تھی۔ گھر میں سارے دن خاموشی سی چھائی رہتی۔ باتیں ہوتیں تو خامشی کا تاثر اور گہرا ہو جاتا") ایک مکمل تہذیب کے مٹنے کی طرف بلیغ اشارہ ہے،" آخری موم بتی" دوہرا مفہوم رکھتا ہے۔ اولاً تقسیم ملک کے ساتھ آنے والے تہذیبی زلزلے کا آئینہ دار ہے، ثانیاً سماجی اقدار میں ہلچل کے زیر اثر پیدا ہونے والے بے شمار انسانی المیوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ انتظار حسین کا الم انگیز لب و لہجہ اس کے افسانوں میں بکھری پڑی چھوٹی چھوٹی تصویروں اور مختصر فقرات سے بھی مترشح ہے۔

اگرچہ انتظار حسین کرداروں کا افسانہ نگار نہیں۔ اس کے افسانوں کا نمایاں وصف ان کا مجموعی تاثر ہے۔ تاہم اس نے دو یادگار کردار تخلیق کئے ہیں۔ پچھوا (ایک بن لکھی رزمیہ) جن حالات سے گزرتا ہے۔ وہ ہماری تاریخ کا اہم باب ہیں۔ پچھوا کی ذہنی کیفیات اس پورے گروہ کی نمائندگی کرتی ہیں جس نے فسادات اور تقسیم کے بعد انسانوں کو بدلتے اور اقدار کو منتشر دیکھ کر احساس ذلت اور

ابتری کو اپنا مقدر جانا۔

عقیلہ خالہ کا کردار بڑی ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے پورا پلاٹ چھوٹے چھوٹے واقعات پر مشتمل ہے، جو الگ الگ اپنے اندر نقطۂ عروج رکھتے ہیں۔ کلائمیکس کا یہ سلسلہ مل کر نہ صرف مزاح کے عنصر کو نکھارتا ہے۔ بلکہ عقیلہ خالہ کے کردار کے تمام پہلوؤں کا احاطہ بھی کرتا ہے تخریبی سرگرمیاں ہوں یا تعمیری، عقیلہ خالہ کے کردار کی ہمہ رنگی نہایت دلچسپ ہے۔

جنس و محبت افسانے کا محبوب موضوع ہے۔ بلکہ عوام الناس کے ذہن میں افسانے کا جو تصور موجود ہے، اسے جنس سے بآسانی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انتظار حسین کے ہاں اس موضوع کو بہت کم دخل ہے۔ لیکن جو چند افسانے اس نے اس سلسلے میں لکھے ہیں۔ ان سے افسانہ نگار کی فنی پختگی ٹپکتی ہے، اس کے بیان میں انفرادیت کا رنگ موجود ہے اور ایسے پیش پا افتادہ، اور ازلی موضوع کے نباہ میں انفرادیت برقرار رکھنا یقیناً بہت قابل تحسین ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں میں جنسوں کا ملاپ کسی سوچے سمجھے فارمولے کے مطابق پُر تصنع ماحول میں نہیں ہوتا۔ یہ ملاپ نہ تو رومانی اور جذباتی رنگ اختیار کرتا ہے اور نہ سستی سنسنی خیزی کے لئے استعمال ہوتا ہے بلکہ مرد اور عورت یا لڑکے اور لڑکی میں جنسی کشش بہت دھیرے دھیرے اور قدرتی انداز میں پیدا ہوتی ہے، محبت کی کلی پراسرار طریقے سے چٹکتی ہے، اور اسی صورت سے زندگی کے مناظر میں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ ایمائیت کی فضا قاری کے ذہن میں تحیر و انبساط کی لطیف کیفیت پیدا کرتی ہے۔

"ٹھنڈی آگ" میں ادھیڑ عمر بیوہ رقیہ اور بڑھاپے کے دروازے پر کھڑے مختار صاحب ہیں باہم مراسم اتنے آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں کہ خود انہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب کھنچے آرہے ہیں۔ اتنا قریب کہ دونوں میں سوئے ہوئے جنسی جذبات دوبارہ انگڑائی لے کر جاگ اٹھتے ہیں۔ مختار، ایک اوسط درجے کا زمیندار ہے، ہوش سنبھالتے ہی وہ شادی کے بندھن میں جکڑ دیا گیا۔ عورت سے بیش از وقت واسطے نے اس کے جنسی جذبات کو ٹھنڈا کر دیا ہے، اب وہ تنہا اپنی بیوی اور اولاد سے الگ بڑی مطمئن زندگی بسر کرتا ہے اور ننھیال میں مقیم اولاد سے اس کا تعلق بس واجبی سا ہے۔ روپیہ پیسہ ارسال کر دیا یا غلہ بھجوا دیا، رقیہ عرصے سے بیوہ ہے اور اس نے اپنی جسمانی خواہشات کو مکمل طور پر دبا رکھا ہے لیکن مختار صاحب سے ملاقات پر اس کا سویا ہوا جسم

دوبارہ جاگ اٹھتا ہے۔

"چولھے کی آگ بالکل ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی، راکھ اندر سے گرم نکلی۔ اسے دس سال پہلے کی بیتی باتیں پھر یاد آرہی تھیں، مگر ایک دھندلا سا خواب بن کر کئی مرتبہ اس کا جی چاہا یہ خواب اس کا کوئی منظر پھر زندہ ہو جائے، مگر اس کا جی ڈوبنے لگتا ہے۔"

"سوئے جذبات میں یہ ہلکا سا ارتعاش کسی جنسی آوارگی کا پیش خیمہ نہیں بنتا، بلکہ یہ رقیہ کی حسرت بھری، قدغن زدہ زندگی کے دل گداز پہلو پر دریچہ وا کرتا ہے۔ ایک معمولی اشارے کی مدد سے سماجی زندگی کی ایک مکمل تصویر نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔

"دیولا" کا موضوع محبت کا وہ پہلا شگوفہ ہے جو ایک نوخیز دل میں ابھرتا ہے لیکن بن کھلے ہی مرجھا جاتا ہے مجو دور دور ہی سے پتنگ اڑاتے ایک نوخیز دوشیزہ کا نظارہ کرتا ہے اظہار محبت کا مرحلہ ہی نہیں آتا۔ بلکہ مجو کو خود شعوری طور پر احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ لڑکی سے محبت کرنے لگ گیا ہے۔ محبت کا جذبہ دل کی تاریک گہرائیوں سے غیر محسوس طریقے سے سر اٹھاتا ہے۔ اور شعوری حیثیت اس وقت اختیار کرتا ہے۔ جب موت اس دیولے کو اچانک بجھا دیتی ہے۔ جس کی لو نے مجو کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ افسانہ نگار نے مجو کے احساس حرمان کا اظہار بڑے عمدہ انداز میں کیا ہے "رات کو میں نے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا . . . . میں نے دیکھا کہ میری پتنگ ٹوٹ گئی ہے اور میں کوٹھوں کوٹھوں اس کے پیچھے دوڑتا چلا جا رہا ہوں۔ میں دوڑتے گیا۔ میں دوڑتے گیا۔ پھر کیا دیکھوں ہوں کہ ایک میدان ہے چٹیل میدان، سنسان بیابان، آدمی نہ آدم زاد اور پتنگ غائب۔"

"کیلا" میں ایک نوعمر لڑکا دیوالی کا دیا چوری کرتے پکڑا جاتا ہے، اسی پکڑ دھکڑ میں جوان کیلا کے جسم کے مس سے غیر متوقع طور پر اس کے دل میں جنسی خواہش کی مبہم سی صورت پیدا ہوتی ہے۔

"جب ہاتھ نہ چھڑا سکا تو اس نے کیلا کی کلائی پر کاٹنے کی کوشش کی، اس نے بھینچ کر کاٹنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن کلائی سے مس ہوتے ہی اس کے دانتوں کی کپکپاہٹ ختم ہو گئی۔ کیلا کی گرفت اچانک ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ اس کی کلائی چھوڑ، ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی۔ وہ اک ذرا ہانپنے لگی تھی، اس نے اپنی کلائی کو جو اس کے لبوں اور دانتوں کے لگنے سے نم آلود ہو گئی تھی۔ آنچل سے پونچھا، سر پر ساڑھی کا پلو درست کیا اور عجلت سے اندر چلی گئی وہ یہ تو نہ سمجھ سکا کہ بات کیا ہوئی۔ مگر وہ شہد آمیز نرمی اس کے ہونٹوں پر اور دانتوں کے کناروں پہ دیر تک ایک عجیب سی لذت کے ساتھ گھلتی رہی۔"

"ساتواں در" میرے خیال میں اس قدر حسین ہے کہ اس کے صوری جمال کو صرف محسوس ہی کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس احساس کو لفظوں کا جامہ پہنانا دشوار ہے۔ قصہ ایک پالتو کبوتری کا ہے لیکن اس کبوتری سے متعلق تفصیلات کو معروضی تلازمہ بناکر ایک نوعمر لڑکے اور ایک نوخیز لڑکی کا جنسی confrontation، جس ایمائی انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

"مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے اس کے بال پکڑ لئے۔ وہ مجھ سے بال چھڑانے لگی۔ مگر میں کہاں چھوڑنے والا تھا۔ اس نے مجھے کیوں مارا تھا۔ میں اس سے گتھم گتھا ہوگیا۔ مگر ایک ساتھ، جانے کیوں، میرا دل دھڑکنے لگا اور سارے بدن میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ میرے ہاتھ، میں جیسے پھر ...... دھڑکتا دکھتا پوٹا، نرم نرم پر جن پر بجلی دوڑ رہی ہو ...... میرے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ مجھے جھٹک وہ ایک طرف جاکھڑی ہوئی۔ کالی چمکیلی کئی لٹیں اس کے گال پر آگری تھیں اور بال بگڑ سے گئے تھے، نفسیاتی صداقت، خارج اور داخل میں تطبیق، اور ایمائیت کے اعتبار سے "ساتواں در" بہت ہی اعلیٰ افسانہ ہے۔

"جنگل" امرد پرستی کے میلان پر لکھا گیا ہے لیکن اس رجحان کو نفسیاتی کجروی کے طور پر پیش نہیں کیا گیا۔ سن بلوغت کو پہنچتے ہوئے چند لڑکے، باہم ایسے ماحول میں، اور ایسے راستوں سے گذرتے دکھائے گئے ہیں جہاں قدرتی طور پر جنسی خواہش ابھر سکتی ہے۔ اس افسانے میں انتظار حسین کا انداز بیان البتہ بڑا واشگاف ہے۔

"اُجلے پانی میں بھیگ کر اس کی گوری ٹانگیں اور زیادہ گوری نظر آنے لگیں۔ اس کی رانیں تو بالکل چکنی تھیں۔ البتہ پنڈلیوں پر بہت ہلکا ہلکا نرم ریشمیں سنہری رواں نظر آرہا تھا۔ اس کی نرم گوری رانوں کو دیکھ کر کچھ ایسا لگتا تھا کہ اللہ میاں نے سونے کی پتریاں جما کر اس کی پنڈلیاں بنائیں۔ اس نے نیلا نیکر پہن رکھا تھا جو پیچھے سے کچھ زیادہ چست ہوگیا تھا۔ یا شاید جسم کی چستی کی وجہ سے چست نظر آرہا تھا۔ چست نیکر کو دیکھتے دیکھتے نور کا ذہن باڑی کے زرد زرد خربوزوں کی بٹیوں کی طرف منتقل ہوگیا۔"

انتظار حسین کے شروع کے افسانے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے "آخری آدمی" میں ایک بہت بڑی تخلیقی چھلانگ لگائی ہے۔ میرے خیال میں ہر قاری کا پہلا تاثر یہی ہوگا لیکن اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ "کنکری" کے بعض افسانوں میں ایسے عناصر ملتے ہیں جو انتظار کی ابتدائی اور تازہ ترین افسانہ نگاری میں رشتہ پیدا کرتے ہیں۔

"آخری آدمی" کا فوق الفطرتی اور داستانی ماحول اس کے کئی ایک پہلے کے افسانوں میں ملتا

ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اقتباسات دیکھئے۔

" نور رکا اور پھر بولا' اچھا تھوڑی دیر بعد جو میں نے مڑ کے دیکھا تو قبوتر غائب۔

" قبوتر غائب ؟"

" ہاں قبوتر غائب اور اس کی جگہ ایک سفید پوش آدمی، بالکل سفید براق ....." (جنگل)

" کوئی چیز اس کے مارد وہ اسے چونچ میں داب کے اڑ جاوے گا اور ندی میں جا کے ڈال دیوے گا۔ وہ چیز گھلتی جاوے گی اور آدمی بھی گھلتا چلا جاوے گا ..." (کنکری)

اور "ساتواں در" کا نہ صرف عنوان بلکہ سارا تار و پود بھی داستانوں کے اثر کا غماز ہے۔ فوق الفطرت واقعات توہم پرستی کے رجحان اور داستانوی رنگ کا استعمال "کنکری" میں یا تو کردار نگاری کے لئے کیا گیا ہے۔ یا افسانے میں خوف و تحیّر کا سماں باندھنے کے لئے "آخری آدمی" میں یہ عناصر ایک ایسے اسلوب میں ڈھل گئے ہیں جو انتظار حسین کے مخصوص ذہن کے اظہار کے لئے ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

" گلی کوچے" اور "کنکری" کا انتظار حسین رومانی حقیقت نگار ہے۔ "آخری آدمی" میں اسلوب، تکنیک اور وژن کافی حد تک بدل گئے ہیں، البتہ ایک بات مشترک ہے۔ انتظار حسین کا جذباتی لہجہ وہی ہے، وہ پہلے بھی ماتم کرتا تھا۔ اب بھی ماتم کرتا ہے، یہی اس کا مقدر ہے۔ پہلے بچھڑے دیس کی یادیں اس کے دل میں کسک پیدا کرتی تھیں اب اس احساس سے ٹیسیں اٹھتی ہیں کہ اخلاقی اقدار کھوٹے سکے بن کر رہ گئی ہیں۔

" آخری آدمی" کے تقریباً تمام افسانوں میں ماحول اور واقعات خوابوں کی دنیا سے مماثل ہیں۔ جیسے خوابوں میں سبھی کچھ ممکن ہے۔ کیونکہ منطقی تسلسل کی پابندی نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ افسانے بھی منطق کی زنجیروں سے آزاد ہیں۔ لیکن خوابوں کی اپنی منطق ہوتی ہے۔ جو خواب دیکھنے والے کے کردار کے حوالے سے بامعنی بنتی ہے۔ اسی طرح انتظار حسین کی کہانیاں جو غیر منطقی اور غیر عقلی واقعات سے پر ہیں اس کے اپنے ذہن کے حوالے سے اپنی معنویت کا ابلاغ کرتی ہیں۔

" اور ہمارے شیخ، کہ خاک ان کی مسند اور اینٹ ان کا تکیہ تھی، املی کے تنے کے سہارے بیٹھے تھے اور اس عالم سفلی سے بلند ہو گئے تھے۔ ذکر کرتے کرتے اڑتے، کبھی دیوار پر کبھی املی پر جا بیٹھتے، کبھی اڑ جاتے

اور فضا میں کھو جاتے ہیں۔ (زرد کتا)

اس اقتباس سے انتظار حسین کے افسانوں کی خلافِ حقیقت فضا کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر بعض نقادوں نے اس کا تمسخر بھی اڑایا ہے لیکن میرے خیال میں عظیم ادب میں منطق سے بے نیاز اور فوق الفطرت عناصر کی کمی نہیں۔ اور ہر قاری بآسانی انہیں ذہن میں تازہ کر سکتا ہے، ان کی موجودگی یا عدم موجودگی سے فن کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ خود ہمارے ادب میں بھی ان کی حیثیت انوکھی نہیں۔ اس سلسلہ میں انتظار ہی کے ایک مضمون سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ "داستانوں میں انسانات، حیوانات، نباتات اور جمادات الگ الگ برادریاں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک برادری کے مختلف طبقے ہیں جتنا پیچھے جائیے افسانے میں یہ برادری زیادہ مربوط اور گتھی ہوئی نظر آئے گی۔ اتنی مربوط اور گتھی ہوئی کہ خود افسانہ نگار دوسروں سے الگ نہیں پہچانا جاتا۔۔۔۔ الف لیلے میں خوبصورت ساحرائیں کس بے تکلفی سے اپنے عاشقوں پر منتر پھونک کر انہیں کبھی کتا، کبھی ہرن بنا دیتی ہیں اور شہزادے جنگل میں چلتے چلتے مڑ کر دیکھتے ہیں تو پتھر بن جاتے ہیں۔ فسانۂ عجائب میں طوطا درخت سے گر کر پٹخنی کھاتا ہے۔ اور آدمی بن کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جانِ عالم آدمی سے بندر کے قالب میں، بندر کے قالب سے طوطے کے قالب میں اور طوطے کے قالب سے پھر آدمی کے قالب میں منتقل ہو جاتا ہے۔"

انتظار حسین کے افسانوں کی غیر منطقی فضا کو اس کی کامیابی یا ناکامی کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، قابلِ غور سوال یہ ہے کہ افسانہ نگار نے فوق الفطرت واقعات سے کیا کام لیا ہے اور کیا ان کو پلاٹ میں اس طور سمویا ہے کہ قاری پڑھتے وقت از خود عدم یقین کو معطل رکھنے پر رضامند ہو جائے؟ اگر ہم اس انداز سے سوچیں تو انتظار حسین کی انفرادیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس کا تمسخر اڑانا بہت سہل ہے لیکن انتظار کا سمجھنا قدرے دقت طلب ہے۔ میری نظر سے جو تنقید گذری ہے۔ وہ سخت ناقابل برداشت ہے۔ اس کے افسانوں کو نانی اماں کی تکرار بتانا یا صرف لکھنؤ کی مٹتی تہذیب کا ماتم کہنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ تنقید نگاروں نے اسے پڑھا ہی بہت کم ہے۔ عام قاری جو افسانے اس لئے پڑھتا ہے کہ واقعات کے ادھیڑ بن اور کردار کے ارتقا یا عام تجربے کے نشیب و فراز سے لطف اندوز ہو اس کے لئے "آخری آدمی" کے انتظار حسین سے زیادہ مایوس کن اور کوئی افسانہ نگار نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کے افسانوں میں نہ تو مسلمہ معنوں میں کوئی کردار نگاری ہے اور نہ واقعات کا ایسا ڈھانچہ جس میں نقطۂ عروج

شرارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاقی اقدار سے منحرف معاشرے اور افراد نے اس پر گہرے افسوس اور خوف کے اثرات مرتب کئے ہیں اسی خوف اور افسوس کو پیدا کرنے والی المناک صورت حال کا اظہار و ابلاغ انتظار حسین نے علامتی پیرایہ میں کیا ہے۔ اسلوب کو داستانوں کی زبان کے مطابق ڈھالا ہے۔ ماضی کو حال کی تفہیم کے لئے پس منظر بنایا ہے (" میں افسانہ کیا لکھتا ہوں کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا ہوں اور آتش رفتہ کا سراغ لیتا پھرتا ہوں.... حال کوئی بیر بہوٹی قسم کی شے تو ہے نہیں جسے چٹکی سے پکڑ کر ہتھیلی پر رکھ لیا جائے وہ تو آگے پیچھے ماضی اور مستقبل کا جلوس لے کر ظاہر ہوتا ہے") اور بعض افسانوں میں شعور کی رو کے زیر اثر رواج پانے والی افسانوی تکنیک، اور تلمیحی اسلوب کو برتا ہے۔

اقدار کا زوال اور ہوس کاری کی فراوانی ہمارے معاشرے کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ہمدردی محبت، انسانیت، بے لوث خدمت کا جذبہ، دیانتداری، وفاداری سبھی انفرادی اور اجتماعی سطح پر خستہ زدہ پتوں کی طرح لرزاں اور ہر جھونکے کے ساتھ ڈھیر ہو رہی ہیں اور آج ان کی مثال ان تہناد اداس پتوں کی سی ہے جو ٹنڈ منڈ ٹہنیوں پر اپنے وجود کا اعلان کر رہے ہیں۔ منافقت، خود غرضی، مکروفریب، بے ایمانی، احساس عدم تحفظ، حرام خوری اور نفرت کی یلغار ہر جانب سے جس تیزی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ وہ روحانی ترقی کے لئے زہر قاتل ہے۔ اور اس بات کا اطلاق صرف ہمارے معاشرے پر نہیں ہوتا، پوری دنیا اسی بحران سے دوچار ہے۔ جو لوگ پوری صورت حال کو سمجھنے کی اہلیت اور جسارت رکھتے ہیں وہ اس کی سنگینی اور المناک نوعیت سے خائف ہیں۔ انہیں روحانی گھٹن کا احساس ہے۔ گھور تاریکی میں نہ روشنی کی قدر رہی ہے اور نہ اس کی ضرورت کا احساس باقی رہا ہے۔ ایسے میں وہ جن کا سارا سرمایہ ایک ٹمٹماتی شمع ہے، وہ دلگیر نہ ہوں تو کیا کریں۔ ان کی قنوطیت بے وجہ نہیں۔ جب تک انسانی روح میں آزادی کی رمق باقی ہے۔ لوگوں کو " سب ٹھیک ہے " اور قابل قدر ترقی، کے نعرے لگانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا احساس زیاں عین قدرتی ہے۔ کیونکہ جب اجتماعی سطح پر روشنی معدوم ہو جائے تو انفرادی سطح پر اس کا وجود مخدوش اور لایعنی ہو جاتا ہے، روبہ زوال معاشرے میں فرد کی اخلاقی جدوجہد محال اور بے سود معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور اس کی ذات کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ ایسے میں فرد جن کیفیات غم واندوہ سے گذرتا ہے۔ انتظار حسین نے علامتی انداز میں ان کا اظہار کیا ہے۔ جو اپنے اندر فنی رچاؤ رکھتا ہے۔

"آخری آدمی" اور" زرد کتا" اس سلسلے میں نمایاں مثالیں ہیں۔"آخری آدمی" میں الیاسف کی آدمی کی جون میں رہنے کی جدو جہد افسانے کا مرکزی نکتہ ہے الیاسف کے تمام ساتھی بندر بن جاتے ہیں کیونکہ وہ حکم خدا سے منحرف ہو جاتے ہیں اور اجتماعی زندگی کے مفاد کو خود غرضی اور ہوس پر قربان کردیتے ہیں، الیاسف بظاہر حکم خدا کے تابع رہتا ہے۔لیکن مکروفریب سے اس کی نفی کرتا ہے۔ الیاسف کا المیہ یہ ہے کہ اسے اپنی پستی کا مکمل احساس ہے۔ہم جنسوں سے کٹ کر وہ آدمیت برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی ذات میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔

آدمیت کا یہ جزیرہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔تمام مراحل سے گذر کر وہ جلدی سے بندر بننے والا ہے۔لیکن وہ اپنے انحطاط کے رموز سے بخوبی آگاہ ہے۔

بحیثیت مجموعی افسانہ میں ایک کشمکش جاری رہتی ہے۔جس کی لپیٹ میں پوری معاشرتی زندگی سمٹ آئی ہے۔

"زرد کتے" کا ابتدائی حصہ بزرگان دین کے ملفوظات کی زبان میں روحانی زوال کی نشانیوں کا بیان ہے۔

(۱) نفس امارہ کا موٹا ہو جانا، طمعِ دنیا کا حد سے بڑھ جانا یا ہاتھ کا سوالی ہو جانا۔

(۲) علم کا گھٹ جانا، عالم اور جاہل کا فرق ختم ہو جانا۔

(۳) عالموں کا علم چھپانا، اور زبان کو تالے دے لینا۔

(۴) مٹی کا مٹی سے ممتاز ہو جانا۔

اس صورت حال کو چھوٹے چھوٹے واقعات کی مدد سے اجاگر کیا گیا ہے۔شیخ عثمان کبوتر نیکی کی علامت ہے کہ جو رسول صلعم نے کہا شیخ نے ورد کیا، عالم سفلی سے بلند ہو گئے اور طمع دنیا سے منہ موڑ کر قوت پرواز حاصل کی۔ شیخ کے وصال کے بعد ان کے مریدوں، سید رضی۔ ابو مسلم بغدادی شیخ حمزہ، ابو جعفر شیرازی، حبیب بن یحییٰ ترمذی اور ابوالقاسم کا اخلاقی زوال کہانی کا بنیادی موضوع ہے، بالخصوص ابو قاسم کا اپنے نفس امارہ کے خلاف جہاد مرکزی کشمکش ہے۔اور یہ"آخری آدمی" میں الیاسف کی کشمکش سے مماثلت رکھتی ہے، الیاسف کے ساتھی بندر بن گئے اور وہ اکیلا آدمیت کا جزیرہ بنے رہنے کی کوشش کرتا رہا۔ابو قاسم کے پیر بھائی کہ "مردان باصفا تھے اور فقر د

قلندری ان کا مسلک تھا، دنیا کے جھمیلوں میں پھنس گئے، اور ان کا نفس امارہ موٹا ہوتا گیا۔ جو ابو قاسم کو زرد کتے کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ آخری آدمی کی طرح ابو قاسم خضری بھی اکیلا رہ گیا اور اس نے جانا کہ دنیا دن ہے اور وہ روزہ دار۔ رفقاء کے پاس وہ باری باری مسلک شیخ یاد دلانے جاتا ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد رنڈی کے پیروں کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار اور مزعفر کہ طمع دنیا کی علامت ہیں، ایک شیریں کیفیت لئے ہوئے اس کا تعاقب کرتے ہیں اور حجرے میں پہنچ کر اسے بوریا پر زرد کتا، سویا دکھائی دیتا ہے۔ یہیں سے کشمکش شدت اختیار کرتی ہے اور افسانہ سرعت کے ساتھ المیے کا تاثر مرتب کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں قاری خود ابو قاسم کے ساتھ مل کر دعا کرنے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔

"بارالہا آرام دے، آرام دے، آرام دے،

ایک خوفناک روحانی کشمکش سے گذرنے کے بعد آخری فقرہ قاری کو بے بسی کی فریاد معلوم ہوتا ہے الیاسف کی طرح ابو قاسم بھی ٹریجک صورت حال کی تمام پیچیدگیوں کا شعور رکھتا ہے اور اس نے خود سے کہا کہ اے ابو القاسم خضری یہاں سے چل کہ یہاں تیرے باہر اور اندر زرد کتے پیدا ہو گئے ہیں اور تیرا آرام چھن گیا ہے۔

شہر سے ہجرت کے بعد ابو قاسم نے زرد کتے کو مارنے کی بہتیری کوشش کی لیکن آدمی گھٹتا گیا اور زرد کتا بڑھتا گیا۔

"جب سب زرد کتے بن جائیں تو آدمی بنے رہنا کتے سے بدتر ہوتا ہے۔"

اس نے آلائشوں سے دامن پاک کرنے کی ہزار کوشش کی۔ لیکن شہر سے بھاگنے کے باوجود اپنے آپ کو فضا میں معلق نہ کر سکا کہ اس نے دیکھا کہ "زرد کتا دم اٹھائے اس طور کھڑا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں شہر میں ہیں اور اگلی ٹانگیں میری چٹائی پر اور اس کے گیلے گرم نتھنے میرے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو چھو رہے ہیں۔"

"کایا کلپ"، اسی موضوع پر ایک اور زور دار افسانہ ہے۔ اس میں بھی آدمی اپنی آدمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں دکھایا گیا ہے۔ شہزادہ آزاد بخت شہزادی کو سفید دیو سے بچانے کا مکمل ارادہ رکھتا ہے لیکن سمجھوتہ (جو کہ اخلاقی کمزوری کی ایک صورت ہے) کی وجہ سے دورنگی کا شکار ہو جاتا ہے اور

دو رنگی اس کی روحانی کشمکش کی ابتدا ہے۔ وہ وسوسے میں پڑجاتا ہے کہ اصلاً آدمی ہے یا مکھی۔
اس دو رنگی سے نجات حاصل کرنے کی اس نے بہت کوشش کی، بالکل جیسے ابو قاسم نے زرد کتے کو کچلنے کی کوشش کی لیکن اخلاقی جدوجہد کا انجام "کایا کلپ" میں بھی المناک ہے۔ شہزادہ آخری آدمی کی طرح اکیلا رہ جاتا ہے۔ اور اسے اپنی تنہائی کا اسی شدت سے احساس ہوتا ہے۔

" اور جالا شہزادے کے اندر سمانے لگا۔ باہر کی دنیا سے اس کا ناتا ٹوٹنے لگا جیسے اس کے حافظہ پر مکڑی نے جالا پور دیا تھا۔ کہ اب قلعے سے باہر کی دنیا اس کے تصور میں دھندلا رہی تھی"۔

ماضی کے تمام روابط سے یوں کٹنے کے بعد اسے خود اپنی شناخت بھول جاتی ہے۔

آزاد بخت کی کشمکش اپنے اندر المیہ کی پوری شدت رکھتی ہے۔ شہزادے کا کرب واندوہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ مکھی بنے رہنے پر ہی قانع ہو جاتا ہے۔

" تو میں آدمی بھی نہیں ہوں، اور میں مکھی بھی نہیں ہوں پھر میں کیا ہوں؟ شاید میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس خیال سے اسے پسینہ آنے لگا۔ اور اس نے سوچا کہ کچھ نہ ہونے سے مکھی ہونا اچھا ہے۔"

یہ تینوں افسانے فرد کی اخلاقی جدوجہد کا المیہ علامتی پیرایہ میں بیان کرتے ہیں "ہڈیوں کا ڈھانچہ" موضوع کے اعتبار سے متذکرہ بالا افسانوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ مرکزی کردار بدروح سے بچنے کی انتہائی کوشش کرتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اسے اپنی شناخت پر شک بڑھتا جاتا ہے لیکن آخر میں وہ وہی بن جاتا ہے، جس سے وہ گریز کرتا ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے یہ افسانہ مختلف ہے یہاں خیالات اور یادوں کی لہریں ہیں جو مختلف سمتوں سے اٹھتی ہیں اور بظاہر بے ہنگم لگتی ہیں لیکن سبھی کا رُخ ایک خاص مرکزی نقطے کی طرف ہے۔ جو بتدریج زیادہ روشن ہوتا جاتا ہے۔ دھیان کا سلسلہ بے سلسلہ ہوتے ہوئے بھی منظم ہے۔

" کوئی خیال بلا بن کر چمٹ جاتا ہے۔ دماغ کے اندر جا گھستا ہے پھر بلا سے بلا پیدا ہوتی ہے اور بلاؤں کا ہجوم ہو جاتا ہے۔"

اور افسانے میں بلاؤں کا یہی ہجوم المیے کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔"

یہ کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے سے کٹ کر اپنی شناخت کھو چکے ہیں، انتظار حسین کا ایک اور دل پسند موضوع ہے اور اس کا ذکر ادیب کے تجزیے میں بین السطور آچکا ہے۔ افسانہ " پرچھائیں"

کا مرکزی خیال یہی ہے۔ حسن کو تلاش دراصل اپنی ہے۔ لیکن تہذیبی Milieu غائب ہوجانے کی وجہ سے، "ہمسفر" کے کردار کی طرح جو غلط بس میں سوار ہے، اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں پڑتا، جو حقیقت تک رہنمائی کر سکے۔ اس صورت حال کو تلمیحی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور حسن کے خیالات کی رو جب روایت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ تو اس کی بے قراری عارضی طور پر ختم ہو جاتی ہے۔

انتظار حسین کے ان افسانوں میں خارج کی اخلاقی عمارت مسمار ہوتی نظر آتی ہے۔ اور فرد کی ذات کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کے ہاں روایت اور تاریخ کا شعور موجود ہے۔ جس سے موہوم سی امید بندھتی ہے کہ صحیح راہ اختیار کرنے سے فرد اور سماج کی سالمیت بحال کی جا سکتی ہے۔ یوں اس کے فن کا رخ مستقبل کی طرف ہے، البتہ یہ درست ہے کہ امید کی کرن اتنی مدہم ہے کہ مایوسی میں چھپی بمشکل دکھائی پڑتی ہے۔